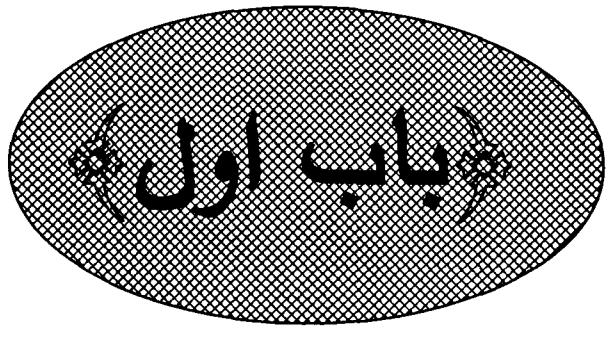

اُردو میں شرح نگاری کی روایت

شرح یا تشریح کے معنی اور مفہوم کو عام قاری کے ادراک کے لئے پیش کرنے کی حسن سعی کا نام ہے۔ شاعری اور شرح کا آپس میں گہرا رشتہ ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہیں کیا جاسکتا۔ ذرا وسیع تناظر یا گہرائی میں جا کر کے دیکھا جائے تو شارح میں شعر فہمی کے علاوہ شعر گوئی کی صلاحیتوں کا ہونا بھی بہت حد تک ضروری ہے، جب ہی وہ شعر گوئی کی قدر و قیمت اور تخلیقی سفر کے دوران شاعر کے داخلی کرب کی کیفیت کا کسی حد تک اندازہ کر سکتا ہے۔

شرح کے معنی کسی مقولہ، بات، حدیث، محاورہ، مکالمہ شعر، اقتباس یا ٹکڑے کی شرح و بسط اور سیاق و سباق و تاریخی حوالہ جات نیز مفہوم و معانی کے ساتھ وضاحت کرنے کے ہیں۔ تشریح یا شرح کئی طرح کی ہوتی ہے۔ جیسے قرآن مجید کی تشریح، کسی دقیق تشری ٹکڑے کی تشریح اور شعر کی تشریح۔

شارح کے لئے لازم ہے کہ وہ شعر کی تشریح اس طرح کرے کہ قاری اس شعر کا مفہوم بخوبی سمجھ لے۔ ہر بڑے شاعر کو سمجھنے کے لئے اس کی ذہنیت اور اس کے فن سے آگاہی حاصل کرنا ضروری

ہے مگر غالبؔ نے اپنے فن کا اظہار بالعموم شاعری اور بالخصوص غزل کی صورت میں کیا ہے۔

شاعری ایک ذوقی اور وجدانی چیز ہے۔ اس لئے اس کی جامع اور مانع تعریف کرنا بہت مشکل ہے لیکن درج ذیل اشارات کی مدد سے اس کا مفہوم کسی حد تک ضرور ذہن نشین ہوسکتا ہے۔

۱۔ شاعری نام ہے انسانی تجربات، خیالات اور جذبات کے اظہار کا۔

۲۔ شاعری موزوں الفاظ میں حقائق کی تصویر کشی کا نام ہے۔

۳۔ بقول میتھو آرنلڈ (Mathew Arnold) شاعری زندگی کی تفسیر

ہے اور اس تفسیر یا ترجمانی میں شعریت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب

اس میں تخیل اور جذبات دونوں موجود ہوں۔

۴۔ شاعری، ادب کی سب سے زیادہ مقبول صورت ہے۔

۵۔ بقول شیلےؔ، شاعری تہذیب، آئین اور مختلف علوم وفنون کا سرچشمہ ہے۔

۶۔ شاعری، موزوں الفاظ میں جذباتِ قلبی کے اظہار کا نام ہے۔

۷۔ سر فلپ سڈنی کا قول ہے کہ شاعری جملہ علوم وفنون کی دایہ ہے۔

۸۔ بقول کیٹس، شاعری ہمیں انتہائی درجہ کی حیرت سے ہم آغوش کر دیتی ہے۔

۹۔ بقول شبلی، شاعری وہ فن ہے جس کی بدولت شاعر دوسروں کے جذبات اور احساسات کو برانگیختہ کر سکتا ہے۔

مشہور شرح نگار اور ادیب پروفیسر یوسف سلیم چشتی کے نزدیک شاعری وہ ملکۂ فطری ہے جس کی بدولت ایک شخص معمولی سی بات کو ایسے مؤثر اور دل کش انداز میں ادا کر سکے جسے سن کر ہر صاحبِ دل بے اختیار تڑپ اٹھے' اس پر ایک عالم کیف وسرور طاری ہو جائے اور وہ شعر بلا کوشش اس کے صفحۂ دل پر نقش ہو جائے۔

شعر در اصل ہیں وہی حسرت سنتے ہی دل میں جو اتر جائیں

بالفاظِ دیگر شاعری بات کہنے کا فن ہے اور شعر اس فن کا خارجی مظہر ہے۔ بقول اقبالؔ ۔

حق اگر سوزے ندارد حکمت است　　شعری گردد چو سوز از دل گرفت

یعنی شعر نام ہے کسی حق بات کو اس انداز سے کہنے کا کہ اس میں کہنے والے کا سوزِ دل بھی شامل ہو جائے۔ اسی سوزِ دل کو علامہ اقبالؔ نے ''خون جگر'' سے تعبیر کیا ہے۔

غالبؔ کا رجحان طبع فلسفیانہ تھا۔ اسی لئے نقادانِ فن نے اُنہیں اردو زبان کا سب سے پہلا فلسفی شاعر قرار دیا ہے۔ فلسفی شاعر کی طبیعت میں جستجو اور تحقیق کا مادہ ہوتا ہے۔ غالبؔ نے فن شاعری میں متجہدانہ بالغ نظری سے کام لے کر اپنے لئے جداگانہ اسلوب بیان پیدا کیا۔

غالبؔ کی شاعری کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کلام میں چار قسم کے اشعار پائے جاتے ہیں بعض اشعار اس قدر پیچیدہ ہیں کہ ان کا مفہوم سمجھنے کے لئے بڑی کاوش کرنی پڑتی

ہے۔اس کی تفصیل آگے چل کر ان اشعار کی شرح کرتے وقت بیان ہوگی۔ یہ اشعار زیادہ تر وہ ہیں، جو انھوں نے فارسی کے مشہور شاعر بیدؔل کے رنگ میں کہے ہیں۔ ان کی نسبت وہ خود کہتے ہیں۔

طرز بیدؔل میں ریختہ لکھنا اسداللہ خان! قیامت ہے

ان اشعار میں نہ شعریت ہے نہ معنویت ، یہ محض دماغی ورزش ہے۔بعض اشعار ایسے ہیں جن میں انھوں نے لفظوں کا طلسم باندھا ہے بالفاظِ دیگر یہ اشعار' کوہ کندن وکاہ برآوردن، کا مصداق ہیں۔ بندش کے اعتبار سے بہت بلند مگر مضمون کے اعتبار سے بلند نہیں ہیں ان میں زیادہ تر ناسخ کا رنگ جھلکتا ہے۔ بعض اشعار میں مضمون آفرینی بھی ہے اور انداز بیان بھی دل کش ہے۔ ان اشعار میں مومؔن کا رنگ پایا جاتا ہے۔بعض اشعار تیرونشتر کا کام دیتے ہیں' یعنی ان میں شعریت پائی جاتی ہے۔زبان صاف ہے، بندش نہایت دل کش ہے اور خیالات کی ایک دنیا آباد ہے۔ ان میں زیادہ تر میرؔ کا انداز نمایاں ہے۔

ہے۔اس کی تفصیل آگے چل کران اشعار کی شرح کرتے وقت بیان ہوگی۔ یہ اشعار زیادہ تر وہ ہیں، جو انھوں نے فارسی کے مشہور شاعر بیدلؔ کے رنگ میں کہے ہیں۔ ان کی نسبت وہ خود کہتے ہیں۔

طرز بیدلؔ میں ریختہ لکھنا اسداللہ خان! قیامت ہے

ان اشعار میں نہ شعریت ہے نہ معنویت ، یہ محض دماغی ورزش ہے۔بعض اشعار ایسے ہیں جن میں انھوں نے لفظوں کا طلسم باندھا ہے بالفاظِ دیگر یہ اشعار' کوہ کندن وکاہ برآوردن، کا مصداق ہیں۔ بندش کے اعتبار سے بہت بلند مگر مضمون کے اعتبار سے بلند نہیں ہیں ان میں زیادہ تر ناسخ کا رنگ جھلکتا ہے۔ بعض اشعار میں مضمون آفرینی بھی ہے اور انداز بیان بھی دل کش ہے۔ ان اشعار میں مومنؔ کا رنگ پایا جاتا ہے۔بعض اشعار تیرونشتر کا کام دیتے ہیں' یعنی ان میں شعریت پائی جاتی ہے۔زبان صاف ہے، بندش نہایت دل کش ہے اور خیالات کی ایک دنیا آباد ہے۔ ان میں زیادہ تر میرؔ کا انداز نمایاں ہے۔

کلام غالبؔ کی کئی شرحیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن اتنی شرحوں کے بعد بھی اس میں شرح کی گنجائش نظر آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بہت سے سربستہ مضامین ابھی کھلے ہی نہیں ہیں۔

شاعری کے ہزار روپ ہیں اور ہر روپ کا اپنا ایک مقام، اپنا جواز اور اپنی دلکشی ہے، لیکن ادب کی برگزیدہ اور وقیع تخلیقات کسی ایک فرد کی تخلیق نہیں ہوتیں۔ انھیں پورے عہد یا ایک معاشرے کی تخلیق کہا جا سکتا ہے، بلکہ ان میں کچھ ایسے ابدی مسائل یا حقائق بھی مضمر ہوتے ہیں کہ ہر عہد کا ذہن ان کے ساتھ جڑا رہے۔ اشعار غالبؔ کا مفہوم صرف وہ ہی نہیں جو ان کے معاصرین نے سمجھا یا بعد کے شارحین نے بیان کیا بلکہ وہ بھی نہیں جو خود غالبؔ نے بتایا۔ اصل مفہوم وہ ہے جو ہمارے دل کو لگے۔ جہاں تک غالبؔ کے اشعار کا تعلق ہے ان میں کسی کھینچ تان کے بغیر ایسے مضامین نکل آتے ہیں جو اکثر ہمارے فاضل شارحین کی نظر سے اتفاقاً اوجھل رہے ہیں یا ان کے طرزِ فکر سے مناسبت نہیں رکھتے تھے۔

غالبؔ کی ایجاز پسندی ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ چنانچہ ایسا شاعر تو علامت کا سہارا لئے بغیر چل ہی نہیں سکتا تھا۔ خاص طور پر

غزل تو بقول غالبؔ ایک ایسے تنگ نالے ہیں جن میں دو مصرعوں کی محدود بساط کے اندر فن کے تمام تقاضوں کو نبھاتے ہوئے پوری بات کہنی لازم آتی ہے۔ غالبؔ کا یہ قول ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آئے

اُردو کے شعراء میں بشمول علامہ اقبالؔ، کسی شاعر کے کلام کی اتنی شرحیں نہیں لکھی گئی جتنی غالبؔ کے اردو دیوان کی لکھی گئی ہیں۔ ان کے کلام کی شرح نگاری کا سلسلہ ان کے عہد سے لیکر کے آج تک جاری ہے۔ غالبؔ کی شاعرانہ عظمت اور برگزیدگی کا احساس ان کے ہم عصروں کو ضرور تھا اور انھوں نے مختلف طریقوں سے اس کا اعتراف بھی کیا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی زندگی میں یہ صورت حال کم و پیش خواص کے حلقے ہی تک محدود رہی جسے ہم قبولیتِ عامہ کہتے ہیں۔

غالبؔ کی وفات کے بعد ان کی طرف لوگوں کا رجحان بتدریج ترقی کرنے لگا۔ اس تبدیلی میں ''یادگار غالبؔ'' کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔

پہلی بار ان کے پورے کلام (اردو اور فارسی) کا تفصیلی جائزہ لے کر اس کی خوبیوں کو اجاگر کیا گیا۔

مولانا الطاف حسین حالؔی، غالبؔ کے شاگرد تھے۔ جب وہ پہلی مرتبہ ۱۹۵۴ء میں تعلیم کی غرض سے دِلی آئے تو یہاں ان کی ملاقات غالبؔ سے ہوئی۔ مولانا حالؔی اسی زمانے میں شعر بھی کہنے لگے اور جب انھوں نے اپنا کلام غالبؔ کو دکھایا تو غالبؔ نے ان سے کہا:۔

''اگر چہ میں کسی کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں
دیا کرتا۔ لیکن تمہاری نسبت میرا
یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو
اپنی طبیعت پر ظلم کرو گے۔''[1]

مولانا حالؔی نے یہ کتاب غالبؔ کی سوانح عمری کے لئے نہیں لکھی تھی دراصل وہ غالبؔ کی شعری اور ادبی حیثیت اور اس میدان میں ان کی بلند پایگی نمایاں کرنا چاہتے تھے۔ ''یادگارِ غالبؔ'' میں جہاں انھوں نے کلام غالبؔ کی لفظی و معنوی خوبیوں اور خصوصیتوں

---

[1] مولانا الطاف حسین حالؔی یادگارِ غالبؔ حصہ اُردو ص - 6

سے بحث کی ہے۔ وہاں مثال میں ان کی اشعار بھی دئے ہیں اور ان اشعار کی معنوی نزاکتوں کو بہت دل نشین پیرائے میں سمجھایا ہے بعض اشعار کا وہ مفہوم، جو آج سمجھا جاتا ہے سب سے پہلے مولانا حالی ہی نے بیان کیا تھا۔ مثلاً ؎

کون ہوتا ہے حریف مئے مردِ افگنِ عشق
ہے مکرر لب ساقی یہ صلا میرے بعد

اس طرح کے اشعار کی اور بھی مثالیں ہیں جنہیں مولانا حالی نے اس طرح پیش کیا ہے کہ غالب کے فن کی عظمت کا گہرا نقش دلوں پر بیٹھ جاتا ہے۔

غالب کے ماننے والے اور مداح وثناء خواں ملک کے ہر گوشے میں پائے جاتے ہیں۔ مغل سلطنت کے آخری تاجدار اور بڑے شاعر بہادر شاہ ظفر نے بھی اپنی حیثیت کے مطابق ان کی خاصی قدر کی۔ حقیقت یہ ہے کہ مرزا غالب کی قدر جیسی کہ چاہئے جلال الدین اکبر کرتا یا جہانگیر وشاہجان۔

مگر جس قدر اس اخیر دور میں ان کو مانا گیا اس کو بھی نہایت مغتنم سمجھنا چاہیئے۔

بکے مفت یاں ہم زمانے کے ہاتھوں
یہ دیکھا، تو تھی یہ بھی قیمت زیادہ

غالبؔ کو فارسی زبان میں (خواہ نظم ہو یا نثر) ہر قسم کے مضامین بیان کرنے پر ایسی قدرت حاصل تھی جیسی کہ ایران کے ایک بڑے سے بڑے ماہر استاد کو ہونی چاہیئے۔ غالبؔ کی زندگی کے حالات کی تحقیق وفراہمی کے لئے مولانا حالیؔ کو جو مواقع حاصل تھے وہ کسی دوسرے کو حاصل نہ ہو سکتے تھے۔ خواجہ مرحوم غالبؔ کے عزیز شاگرد تھے۔ اکثر غالبؔ سے ملتے رہتے تھے اور ان کے تمام حالات پوچھتے اور سنتے رہے ہوں گے۔ انھوں نے غالبؔ کی زندگی میں ان کی تمام تصانیف کا مطالعہ بھی کیا ہوگا۔ اور جو تحریرات غالبؔ کی زندگی کے واقعات وحالات کا مرقع تھیں ان کے غیر واضح حصوں کو خود غالبؔ سے واضح کر لیا ہوگا یا واضح کر لینا چاہیئے تھا۔ لیکن افسوس کہ ''یادگار'' ان توقعات کو پورا نہیں کرتی جو حالیؔ اور غالبؔ کے گہرے

تعلقات کی بناء پر اس کتاب سے وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

یادگار غالبؔ جیسی بلند پایہ کتاب کے بعد سوانح غالبؔ کی ترتیب کیوں ضروری سمجھی گئی؟ اگر شاعر و ادیب کے سوانح حیات کی ترتیب کا حقیقی مدعا یہ ہوتا ہے۔ کہ اس کی تصانیف کے فہم میں زیادہ سے زیادہ مدد ملے۔ اس ماحول کے متعلق زیادہ سے زیادہ آگاہی حاصل ہو جائے۔ لیکن ''یادگار'' کی بلند پایگی کے اعتراف کے باوجود کہنا چاہئے کہ یہ اس مدعا کی تکمیل کا مرقع نہیں بن سکتی۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ غالبؔ کو آج ہندوستان میں جو ہر دلعزیزی حاصل ہے اس کے پیدا کرنے میں ''یادگار غالبؔ'' کا بہت بڑا حصہ ہے۔

شارحین غالبؔ میں ایک اور اہم نام آغا محمد باقرؔ کا ہے۔ موصوف کلام غالبؔ کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''مجھے مدت دراز سے دیوان غالبؔ کے مطالعے کا شوق تھا اور میں اس بات کو کلام غالبؔ کا معجزہ خیال کرتا ہوں کہ یہ شوق کسی عنوان کم نہیں ہونے پاتا بلکہ بڑھتا ہی چلا جاتا تھا۔ میں صفائی سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ نہ تو

میں غالبؔ کے کس خاص نقطۂ نظر سے سمجھنے
کا دعویدار رہوں، نہ دیگر شارحین کی طرح
ان کی زبان اور طرز بیان پر نکتہ چینی کرنے
کے لئے اس میدان میں گامزن ہوا ہوں۔ میں
تو غالبؔ کے دلدادوں میں سے ایک دلدادہ
ہوں اور ان کے کلام کو روحانی مسرت اور
قلبی تسکین کا بہترین ذریعہ خیال کرتا
ہوں۔ میں نے ہمیشہ ایک طالب علم کی
حیثیت سے دیوانِ غالبؔ کا مطالعہ کیا
ہے اور یہ شرح اسی مطالعہ کا نتیجہ ہے'' [1]

کلام غالبؔ سے لطف اندوز ہونے کے لئے آغا محمد باقرؔ نے یادگارِ غالبؔ (مصنف مولانا حالیؔ) شرح حسرتؔ موہانی، طباطبائی، بیخود، آسیؔ، شوکتؔ میرٹھی اور سعیدؔ وغیرہ کو سامنے رکھ کر ان کا فکری گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ موصوف کی کوشش یہ تھی کہ ایک ایسی الگ جامع شرح تیار کی جائے جو دیوان غالبؔ کے طلباء کو بیک

---

[1] آغا محمد باقر بیان غالبؔ (شرح دیوان غالبؔ) ص 1

وقت مختلف شرحوں کی چھان بین سے مستغنی کردے تو یقیناً یہ ایک بڑی ادبی خدمت ہوگی۔ وہ دیگر شارحین نے کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچانے کے خیال کے تحت اس سلسلے میں آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

''جب مجھے یقین ہوگیا کہ میری شرح سے دوسری
شرحوں کی مقبولیت پر کوئی اثر نہ پڑے گا
تو میں نے بیان غالبؔ کی تکمیل کا مصمم
ارادہ کر کے کام شروع کر دیا۔'' [1]

شرح کرتے ہوئے آغا محمد باقر نے دیوان غالبؔ کی شرح پڑھنے والوں کو اگر بالتفصیل نہیں تو اختصاراً ضرور اس بات سے آگاہ کرایا ہے کہ مختلف شارحین نے غالبؔ کے ہر شعر کو کس نقطہ نظر سے دیکھا ہے چنانچہ جن اشعار پر شارحین نے اختلاف کیا ہے۔ آقا محمد باقرؔ نے ان کے نقطۂ نظر کو بھی پیش کیا ہے تا کہ پڑھنے والے آسانی سے سمجھ جائیں کہ اس شعر کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پر۔

---

[1] آغا محمد باقر بیان غالبؔ (شرح دیوان غالبؔ) ص 1

15

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

پتھر ترے دروازے پر ہمیشہ پڑا رہتا ہے لیکن میرے نصیب پتھر جیسے بھی نہیں کہ میں ترے دروازے پر ہمیشہ پڑا رہتا۔ ایسی زندگی پر افسوس ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کاوش میں ترے سنگ در کی طرح ہمیشہ ترے در پر پڑا رہتا۔ (بیخود، آسی، حسرتؔ) سعیدؔ اس شعر کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میں ترے در پر پتھر کی طرح پڑا رہتا ہوں لیکن پھر بھی مطلب براری نہیں ہوئی یعنی میں پتھر نہیں ہوں کہ اس طرح ہمیشہ ترے در پر پڑا رہوں۔ نظم طباطبائی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس زندگی سے پتھر ہونا بہتر تھا کہ شاید تراسنگ در ہوتا۔

آقا محمد باقرؔ کی شرح کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ غالبؔ پر تنقیص یا نکتہ چینی سے عموماً گریز کیا ہے، ہاں البتہ جن اشعار کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے ان کی معنوی اور لفظی خوبیوں پر بالالتزام اور مسلسل روشنی ڈالی ہے۔ لیکن بعض مقامات پر مختصراً شرح کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں مثلاً۔

ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں
وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا

لکھتے ہیں کہ وہ زمانہ گیا جب دل اپنی جگہ آرام سے تھا اور جگر اپنے مقام پر، اب تو ان کے ایک تیرِ نظر نے دونوں کو چھید کر مجروح کر دیا ہے۔

آغا محمد باقر شرح کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"میری شرح کا مطالعہ کرتے وقت یہ بات خاص طور پر یاد رکھنی چاہیئے کہ جس شرح پر تمام شارحین متفق ہیں۔ اس کے تحت یہ لکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی کہ تمام شارحین ہم خیال ہیں۔ نیر جہاں کس شعر کی شرح لکھنے کے بعد کسی شارح کا کوئی مختلف مفہوم درج کیا گیا ہے تو اس سے یہ سمجھنا چاہیئے کہ باقی شارحین میرے ہم خیال ہیں اور محض اسی شارح کو مجھ سے اور دیگر

شارحین سے اختلاف ہے۔ اسی طرح
جہاں چند شارحین ایک خیال پر متفق
ہیں اور باقی دوسرے خیال پر مجمع
وہاں بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔
ہاں طوالت سے بچنے کی لئے ایسے شارحین
کا نام اختلافی شرحوں کے تحت میں نظر
نہ آئے، ان کو میرا ہم خیال تصور کرنا چاہئے۔"[1]

اُردو میں دیوان غالبؔ کے، جیسا کہ گذشتہ سطور میں ذکر آچکا ہے، شارحین کی خاصی طویل فہرست ملتی ہے۔ اپنے موضوع کی حدود کو نظر میں رکھتے ہوئے جب غالبؔ پر مولانا غلام رسول مہرؔ کی کتابوں اور تحریروں کا جائزہ لیا جاتا ہے تو اس میں وہ "کم عیار" نہیں ہیں۔ غلام رسول مہرؔ نے ہر لحاظ سے اس محبت کو نبھایا ہے جو اوائل عمر ہی میں انھوں نے غالبؔ کے لئے محسوس کی تھی۔ ان کی ذاتی زندگی حسن و عشق کی حشر سامانیوں سے معریٰ نظر آتی ہے۔ ان کی پہلی محبت غالبؔ ہے اور یہی بہت بڑی بات ہے۔ یہ ایک دل چسپ ادبی ظن

---

[1] آغا محمد باقر بیان غالبؔ (شرح دیوانِ غالبؔ) ص 2

بھی ہے کہ اگر انھوں نے غالبؔ کی بجائے میر تقی میرؔ سے عشق کیا ہوتا ،تو ان کی تنقیدی حس پر کیسے اثرات مرتب ہوتے؟ تاہم یہ امر بھی توجہ طلب ہے کہ غالبؔ کے بعد انہیں مولانا ابوالکلام آزادؔ اور علامہ اقبالؔ سے خصوصی شغف تھا۔

مولانا غلام رسول مہرؔ نے غالبؔ کو قدیم و جدید کے درمیان ایک ''برزخ'' قرار دیا تھا۔ کلام غالبؔ کی شرح ایسی برزخ کی تخلیقی جہات کو سمجھنے کی کوشش ہے۔ مہر صاحب نے ''دیوان غالب'' کی شرح ''نوائے سروش'' کے نام سے لکھی ہے۔ یہ دعوی تو نہیں کیا جا سکتا کہ نوائے سروش عہد آفریں رجحان ساز ہے لیکن اتنی گئی گذری بھی نہیں۔ اس کے مطالعے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ غالباً مولانا مہرؔ کے ذہن میں اردو ادب کے اساتذہ اور طلبہ کی نصابی ضروریات رہی ہوں گی کیونکہ مشکل الفاظ کے معانی درج کرنے کے ساتھ ساتھ انداز تشریح ناقدانہ ہونے کے مقابلے میں معلمانہ زیادہ ہے۔ اسی لئے بعض اوقات ایسے الفاظ کے معانی بھی درج کر دیئے گئے ہیں جو قاری کے لئے مشکل تو نہ ہوں گے مگر اوسط درجے کا طالب علم شاید ان سے واقف نہ ہو۔

غالبؔ کی نفسیات کا اگر مطالعہ کریں تو ان کے ہاں محبوب کے پاؤں سے جنسی رغبت (Foot Fetishism) کے واضح آثار ملتے ہیں لیکن اس قسم کے اشعار کی تشریح میں مولانا مہرؔ کا ذہن اس طرف نہیں جاتا۔ مثال کے طور پر یہ شعر ؎

لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

مولانا غلام رسول مہرؔ صاحب نے غالبؔ کے کلام نظم و نثر اور اس کی نجی تحریروں سے اس کے حالات زندگی فراہم کئے ہیں جن کی صداقت سے کوئی دوسرا شخص تو درکنار خود صاحب سوانح بھی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن مہرؔ صاحب کا شرف یہ ہے کہ انھوں نے اس مواد سے وہ فائدہ اٹھایا جس کی توفیق مراز صاحب کے عقیدت مندوں میں سے کس کو کسی بھی نہ ہوئی تھی۔ غلام رسول مہرؔ صاحب ادب کا نہایت بلند اور سلجھا ہوا ذوق رکھتے تھے اور تحقیق و تفتیش کے معاملے میں بھی انتہا درجے کے محتاط نظر آتے ہیں۔ مہرؔ صاحب نے

دیوان غالب کا مطالعہ کیا تو ان کے دل میں جذبۂ عقیدت و نیاز پیدا ہوا۔ ہوش سنبھالتے ہی کسی دوسرے شاعر کی عقیدت کا حلقہ اپنی گردن میں ڈالے بغیر غالبؔ کے معتقد بن گئے۔ مولانا غلام رسول مہرؔ مورخ، محقق، ادبی نقاد، صحافی اور مترجم ہونے کے علاوہ انھوں نے اقبال شناسی اور غالبؔ شناسی میں بھی خصوصی شہرت حاصل کی ہے۔ انھوں نے عمر بھر قلم سے رشتہ استوار رکھا اور اپنی تحریروں ہی کو باعثِ عزت جانا ہے۔ ان کی شخصیت کا پہلو قابل توجہ ہے کہ انھوں خود کمرشل بنانے کی کوشش نہ کی بلکہ بااصول صحافی کی حیثیت سے نیک نامی کمائی۔ اور انقلاب کے ذریعے سے تحریک آزادی میں فعال کردار ادا کیا۔

مولانا غلام رسول مہرؔ تیز قلم مصنف تھے۔ پیشہ ور صحافی ہونے کے باوجود متنوع موضوعات پر کثیر کتابیں لکھنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا ہے۔ لیکن انھوں نے اس مشکل کام کو بھی آسان کر کے دکھایا۔ انھوں نے تاریخی اور مذہبی شخصیات، تاریخی موضوعات برصغیر کی سیاسی تاریخ سے وابستہ اہم موضوعات، علّامہ اقبالؔ، مولانا ابوالکلام آزادؔ مرزا غالبؔ درسیات اور متنوع موضوعات پر علمی اور تحقیقی کتب

کے تراجم کی صورت میں کل 91 کتابیں تحریر مدون یا مرتب کیں۔

مولانا غلام رسول مہر کی تشریح بالعموم مختصر اور ٹو دی پوائنٹ (to the point) ہوتی ہے۔ جب وہ شعر کی توضیح کرتے ہیں تو وہ مغربی انتقاد کی روایت سے آگے نہیں بڑھتے ہیں۔

شارحین غالب کی فہرست میں ایک نام شمس الرحمان فاروقی کا بھی ہے۔ فاروقی صاحب نے ''تفہیم غالب'' کی تصنیف کو دل کش' پسندیدہ اور قابل قدر بنانے کے لئے اپنے مشرقی و مغربی ادب کے خاص مطالعہ، کلام غالب کی مختلف مشہور غیر مشہور شرحوں کے گہرے جائزے اور ترجمان غالب کے طور پر اپنے غیر معمولی تجربے کی روشنی میں بڑی محنت اور عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ شمس الرحمان فاروقی نے ''تفہیم غالب'' میں تمام اشعارِ غالب کو شامل نہیں کیا ہے بلکہ ان اشعار کو موضوع گفتگو بنایا جن میں کس بھی اعتبار سے بحث و مباحثہ کی گنجائش سمجھی گئی ان کا قول ہے:۔

''اظہارِ خیال کے لئے وہی اشعار منتخب ہوں
جن میں کوئی ایسا نکتہ ہو جو عام شارحین

سے نظر انداز ہو گیا ہو یا جن کی شرح میں
کوئی ایسی بات کہنا ممکن ہو جو متداول
شارح سے ہٹ کر ہو۔[1]

تفہیم غالب میں منتخب اشعار کو شامل کیا گیا ہے۔ زبان کو آسان بنانے کی طرف زیادہ توجہ کی گئی ہے اور کئی طرح سے اس کی تحریروں کو بنایا اور سنوارا گیا ہے۔ اشعار کی تشریح نہایت تفصیلی اور مکمل بحث کے ساتھ کی گئی ہے اور ایک ایک بات کو بھرپور وزن اور دلائل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ شمس الرحمان فاروقی نے پورے دیوانِ غالب کی چھان پھٹک کر کے جن اشعار کو زیادہ قابلِ تشریح سمجھا انھیں کی شرح پیش کی ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ فاروقی صاحب نے بعض شارحین سے اختلاف بھی کیا ہے۔ اور شعر کی شرح کرتے وقت دوسرے شارحین کے تشریحی پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ فاروقی صاحب بعض اوقات تشریح کرتے کرتے بڑی طویل بحث چھیڑ دیتے ہیں مثال کے طور پر یہ شعر ملاحظہ کیجیے۔

---

[1] شمس الرحمان فاروقی تفہیم غالب ص - 12

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

اس شعر کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''اس شعر کے بارے میں طباطبائی کا یہ فیصلہ
درست نہیں ہے کہ مصنف کا یہ کہنا کہ
ایران میں رسم ہے کہ دادخواہ کاغذ کے
کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے۔'' [1]

فاروقی صاحب اس قول سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''میں نے یہ ذکر نہ کہیں دیکھا، نہ سنا، کاغذی
پیرہن پہن کر دادخواہی کے لئے جانا مشہور
قدیم ایرانی رسم ہے اور کمال اسمٰعیل کا یہ
شعر اس کے وجود کی دلیل کے لئے کافی ہے۔
کاغذیں جامہ بہ پوشید و بدرگاہ آمد
زادہ خاطر من تا بدد ہی دادمرا [2]

---

[1] شمس الرحمان فاروقی تفہیم غالب ص ۔ 12 [2] شمس الرحمان فاروقی تفہیم غالب ص۔ 22

غالبؔ نے اپنے شعر ''نقش فریادی ہے۔۔۔'' کی تشریح میں لکھا ہے۔ نقش کس کی شوخی تحریر کا فریادی ہے کہ جو صورت تصویر ہے، اس کا پیرہن کاغذی ہے۔ یعنی ہستی اگرچہ مثل تصاویر اعتبار محض ہو، موجب رنج و آزار ہے۔ شارحین غالبؔ نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ شعر انسان کے ضعیف البنیان ہونے کے خلاف احتجاج ہے۔ لیکن طباطبائی اس سے متفق نہیں ہیں اور کہتے ہیں کہ شعر میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے ہستی اعتباری سے نفرت ظاہر ہو۔ حالانکہ معاملہ ہستی اعتباری سے نفرت کا نہیں، بلکہ صرف اس بات کا ہے کہ کاغذ کا لباس فریاد اور دادخواہی پر دلالت کرتا ہے، اور فریاد و دادخواہی غالباً اس بات کی ہے مصور نے از راہ شوخی تصویر کو ناپائدار بنایا ہے۔

شعر کے الفاظ ایک اور معنی کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں اور خود غالبؔ کی شرح اس سلسلے میں ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ پہلے مصرعے کا کلیدی فقرہ ''کس کی'' ہے یعنی ابھی یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچی کہ وہ کون سی ہستی ہے جس کی ''شوخی تحریر'' کے خلاف نقش فریادی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ شعر ہستی کی بے ثباتی یا زندگی کے موجب رنج و آزار ہونے کے بارے میں تو ہے، لیکن اس کا بنیادی

سوال یہ ہے کہ وہ کون سی قوت ہے کہ جس کے جبر و اقتدار کے ہاتھوں پر چیز مجبور ہے۔ یہ نکتہ بھی غور طلب ہے کہ نقش بے زبان ہوتا ہے اور یہ بے زبانی ہی اس کے فریادی ہونے کی دلیل ہے۔ اس طرح کا قول محال غالبؔ کو بہت عزیز تھا۔

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاق نسیاں کا

اس شعر کی شرح میں فاروقی صاحب طباطبائی کے خیال کو بالکل درست ٹھہراتے ہیں کہ اس شعر میں کوئی معنوی خوبی نہیں، صرف حسنِ بیان اور بدیع کا معاملہ ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ اس شعر میں حسن بیان اور بدیع بھی معمولی درجے کے نہیں ہیں۔ بہشت کی تحقیر اسی کے مناسب لفظ یعنی ''گلدستہ'' سے کرنا اور پھر اس طرح کرنا کہ تحقیر کی تحقیر رہے اور وہی چیز باعثِ زنیت بھی ٹھہرے۔ یہ اعلیٰ درجے کی طباعی (wit) ہے جس پر اچھے سے اچھا شاعر بھی انگشت بدنداں ہو جائے۔

طباطبائی کے بعد شمس الرحمان فاروقی، حسرت موہانی کے خیال کی وضاحت کرتے ہیں کہ بے خودی کا عالم ہمارے لئے اس قدر خوش گوار ہے کہ اس کے مقابلے میں ہم نے جنت کو بھی فراموش کر دیا ہے۔ مزید کہتے ہیں کہ حسرت کی توجہ اگر چہ ہلکی ہے لیکن طبا طبائی کے اس خیال کو رد کرنے کے لئے کافی ہے کہ شعر میں معنوی پہلو نہیں لیکن ذرا سے غور کے بعد شعر سے ایک لطیف تر معنی پیدا ہوتے ہیں جو تمام شارحین سے مخفی رہے ہیں۔

شمس الرحمان فاروقی ''تفہیم غالب'' کے دیباچے میں رقم طراز ہیں:۔

> ''میں نے اس کتاب میں جگہ جگہ طباطبائی سے اختلاف کیا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں طبا طبائی کا احترام نہیں کرتا۔ اپنی تمام کمیوں کے باوجود طبا طبائی کی شرح غیر معمولی کتاب ہے۔ اس کا مطالعہ ہر اس شخص کے لئے ناگزیر ہے جسے غالب یا کلاسیکی اردو شعریات سے دل چسپی ہے۔ ''[1]

---

[1] شمس الرحمان فاروقی تفہیم غالب ص 18

حسرتؔ موہانی کے بارے میں ان کا یہ خیال ہے کہ انھوں نے بہت کم اشعارؔ کی شرح کی ہے، اور بہت اختصار سے بھی کام لیا ہے، ورنہ ان کی نکتہ سنجی میں کلام نہیں۔

شمس الرحمان فاروقیؔ نے اگرچہ کلامِ غالبؔ کے منتخب اشعار کی تشریح کی ہے لیکن اس تفصیل سے کی ہے کہ سارے نکتے ظاہر ہو جاتے ہیں۔ کلام غالب کے شارحین میں شاید ہی کوئی ایسا شارح ہو جس نے اس طرح اشعار کی وضاحت کی ہو۔ مثال کے طور پر اگر غالب کا کوئی دوسرا شعر لے لیں، اور اس سے ملتا جلتا غالبؔ کا ہی کوئی دوسرا شعر ہو تو فاروقی صاحب نے کمالِ فن سے دونوں کا موازنہ کر کے دونوں کے مفہوم اس طرح واضح کئے ہیں کہ سارے شبہات ختم ہو جاتے ہیں مثلاً ؎

ہے تجلی تیری سامان وجود
ذرہ بے پرتو خورشید نہیں

یہ شعر پڑھتے ہی غالبؔ کا ایک اور شعر ذہن میں آتا ہے۔

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

غالبؔ نے ذرہ اور آفتاب کا پیکر مختلف شعروں میں استعمال کیا ہے اور ہر جگہ نہایت خوبصورتی کے ساتھ استعمال کیا ہے' پرتو سے آفتاب کے' والا شعر ذہن میں آتے ہی محسوس ہوتا ہے کہ زیر بحث شعر بالکل صاف ہے۔ تیری تجلی ہر چیز کو وجود کا سامان بخشتی ہے ۔ذرہ اسی وقت روشن ہوتا ہے جب اس پر خورشید کی کرن پڑتی ہے۔ اسی طرح، تو مثل خورشید ہے اور ہر شے مثل ذرہ ہے۔ ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ چاہے وہ بڑے سے بڑا وجود ہو تیرے سامنے وہ ذرے کی طرح ہے اور تو مثل خورشید ہے۔

یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ذرہ اس وقت تک وجود میں آتا ہی نہیں جب تک نہ اس پر آفتاب کا پرتو پڑے۔ جس ذرے پر سورج کی کرن نہ پڑے وہ مردہ ہے، بے وجود ہے۔

شارحینِ غالبؔ میں ایک اور اہم نام پروفیسر یوسف سلیم چشتی کا ہے۔ پروفیسر چشتی صاحب نے نہ صرف غزلیات کی شرح لکھی ہے بلکہ قصائد، قطعات اور رباعیات کو بھی شاملِ کلام کیا ہے، اور ہر شعر کو قابلِ فہم بنانے کی سعی کی ہے۔ ،موصوف اس شرح کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے اس کے دیباچہ میں رقم طراز ہیں:۔

''ہندوستان اور پاکستان میں جس قدر شروح
شائع ہو چکی ہیں، میں نے ان سب کا
بالاستیعاب مطالعہ کیا مگر مشکل ترین اشعار
کا مطلب کسی شرح سے مجھ پر واضح نہ ہو سکا۔
اگر یہ بات نہ ہوتی تو میں ہرگز شرح لکھنے کی
جسارت نہ کرتا ''[1]

مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''اب رہی یہ بات کہ میں کہاں تک اپنے
مقصد میں کامیاب ہوا ہوں' اس کا
فیصل قارئین کے ہاتھ میں ہے اور اس
کی صورت یہ ہے کہ پہلے دیوانِ غالب
میں سے مشکل ترین اشعار منتخب کر
لئے جائیں پھر ان کے مطالب اس شرح
میں ملاحظہ کر لئے جائیں۔ حقیقت

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی شرح دیوانِ غالبؔ ص 18

حال خود بخود عیاں ہو جائے گی۔'' [1]

اس شرح کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ شرح سے پہلے ایک مبسوط مقدمہ لکھا گیا ہے۔ اور مطلب بیان کرنے کے بعد ہر شعر کا بنیادی تصور بھی درج کر دیا گیا ہے۔ پروفیسر چشتی صاحب نے آسان اشعار کا مطلب چند سطروں میں لکھا ہے لیکن مشکل ترین اشعار کی شرح میں وضاحت سے کام لیا ہے۔

جو آوں سامنے ان کے تو مرحبا نہ کہیں!
جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیر باد نہیں

یعنی اگر ان سے ملنے جاتا ہوں تو خوش آمدید نہیں کہتے اور اگر ان سے رخصت ہوتا ہوں تو خدا حافظ نہیں کہتے۔

اس شعر کی شرح سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ پروفیسر چشتی صاحب نے مختصر الفاظ میں اس کا مفہوم واضح کر دیا ہے۔ اور ایسی مثالیں اس شرح میں جگہ جگہ پڑھنے اور دیکھنے کو ملیں گی۔ لیکن جہاں وضاحت سے کام لینا ضروری ہے وہاں اس شعر کی شرح میں کوئی کوتاہی نہیں برتتے۔ مثال کے طور پر

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی شرح دیوانِ غالبؔ ص 18

دل میں آجائے ہے، ہوتی ہے جو فرصت غش سے
اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں

اس شعر کی شرح اس طرح بیان کرتے ہیں کہ سارے تصورات جو اس شعر سے اخذ کئے جاسکتے ہیں، واضح ہوجاتے ہیں۔

غالبؔ کے اندازِ بیان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ایسے الفاظ یا جملے استعمال کرتے جنہیں پڑھ کر ذہن مختلف معانی کی طرف مائل ہوسکے۔ پہلا ''تصورِ محبوب'' ہے۔

جب غش سے فرصت ملتی ہے یعنی جب ہوش میں آتا ہوں تو محبوب کا خیال فوراً دل میں آجاتا ہے۔ اور یہ ثبوت ہے نالے کی رسائی کا۔ اگر نہیں تو پھر اور کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں۔

دوسرا تصور ''تصورِ نالہ'' ہے۔ جب غش سے افاقہ ہوتا ہے تو نالہ کرنے کا خیال دل میں آجاتا ہے۔ یہ تصور نالہ کی رسائی کا ثبوت ہے۔ اگر نہیں تو پھر اور کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں غالبؔ نے نالہ کی نارسائی پر لطیف طنز کیا ہے۔ وضاحت اس کی یہ ہے کہ عاشقوں کی اصلاح میں نالہء رسا وہ ہے جس کو سن کر محبوب بے قرار ہوجائے اور بن بلائے عاشق کے پاس چلا

آئے۔غالبؔ تجاہل عارفانہ سے کام لے کر کہتے ہیں کہ ہمارے نالے میں یہ تاثر کہاں! ہم تو اسی نالہ کو رسا سمجھتے ہیں جس کی بدولت تصور محبوب ہمارے دل میں آجائے یا جس کی طرف ہماری طبیعت مبذول ہوجائے۔مختصر یہ کہ غالبؔ نے طنزاً نارسائی کو رسائی سے تعبیر کیا ہے۔

پرفیسر چشتی صاحب کی شرح کا مطالعہ کرتے ہوئے بعض اشعار ایسے بھی ملتے ہیں جہاں نہ تو وضاحت سے کام لیا گیا ہے اور نہ ہی چند سطروں میں شرح کی گئی ہے بلکہ ایسے اشعار کے مطالب مولانا حالیؔ کی ''یادگارِ غالبؔ'' کی روشنی میں بیان کئے گئے ہیں۔مثال کے لئے یہ شعر ملاخط ہو ؎

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے میری بے کسی کی لاج

پردیس میں مرنا، جو ہر شخص کو ناگوار ہوتا ہے اس پر خدا کا شکر اس لئے کرتا ہے کہ اگر وہاں بے گور وکفن پڑے رہتے تو کچھ مضائقہ نہیں، کیونکہ کوئی شخص نہیں جانتا کہ یہ کون تھا اور یہ کس رہتے کا آدمی تھا؟ لیکن وطن میں مرنا، جہاں ایک زمانہ واقف حال ہو مگر

خریدار وغم خوار ایک بھی نہ ہو وہاں مردے کی اس طرح مٹی خراب ہونی سخت رسوائی اور ذلت کی بات تھی۔ پس خدا کا شکر ہے کہ اس نے پردیس میں موت دے کر میری بے کسی کی لاج رکھ لی۔ اس شعر میں گو بظاہر خدا کا شکر کیا گیا ہے لیکن دراصل اہل وطن کی شکایت ہے جس کو ایک عجیب پیرایہ میں ظاہر کیا گیا ہے۔

غالبؔ کا کلام مشاہدات قلبی کا آئینہ ہے اس لئے ہر شخص ان کے کلام سے متاثر ہوتا ہے۔ ان کا کلام داخلی کیفیات کی مصوری، رنگین جذبات کی تصویر کشی، نفس انسانی کی دھیمی آوازوں اور قلب انسانی کی دھڑکنوں کو حسین الفاظ کے پیکر میں پیش کرنے کا فن ہے۔ جو ان کی مقبولیت کا راز ہے۔ غالبؔ شیکسپیئر کی طرح فطرتِ انسانی کے بہت بڑے نبض شناس تھے۔ اسی لئے انھوں نے جذبات و کیفیات قلبی کی اس قدر گوناگوں تصویریں کھینچ دی ہیں کہ جب کسی کو اپنے جذبات واحساسات کا بیان مقصود ہوتا ہے تو اسے ان کے کلام سے ایک نہ ایک شعر حسبِ حال ضرور مل جاتا ہے۔ خواہ وہ شخص واعظ ہو یا خطیب، مومن ہو یا کافر، مدرس ہو یا منشی، ایکٹر ہو یا افسانہ نگار، انشاء پرداز ہو یا فنکار۔

اس بات کا ثبوت علّامہ اقبالؔ کی مشہور نظم 'مرزا غالبؔ' ہے جو ''بانگِ درا'' میں شامل ہے۔ اقبالؔ نے اس نظم میں کلامِ غالبؔ کی مختلف خصوصیات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اقبالؔ کی اس نظم سے چند اشعار بطورِ خراجِ عقیدت پیش ہیں:۔

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا
تیرے فردوسِ تخیل سے ہے قدرت کی بہار
تیری کشتِ فکر سے اگتے ہیں عالم سبزہ وار
زندگی مضمر ہے تیری شوخیِ تحریر میں
تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں
شاہدِ مضمون تصدق ہے تیرے انداز پر
خندہ زن ہے غنچۂ دہلی گلِ شیراز پر
لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں
ہو تخیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں

آہ تو اجڑی ہوئی دہلی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں تیرا ہمنوا خوابیدہ ہے

یعنی علّامہ اقبالؔ جیسے عظیم شاعر بھی ان کی استادی ،عظمتِ فکر اور اسلوبِ بیان کی دل کشی کا اعتراف کرتے ہیں۔

پروفیسر چشتی صاحب کی شرح دیوان غالب خاصی اہم ہے۔ اس کی اہمیت وافادیت کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:۔

''غالبؔ کی شرحوں میں ایک اور اہم اضافہ ہوا ہے اور بعض اعتبار سے شرح بھی اہم ہے۔اس میں نہ صرف مختلف اشعار کا مطلب تفصیل سے لکھا گیا ہے بلکہ کلام کے ہر پہلو پر بہت تفصیلی حواشی لکھے گئے ہیں۔اور اس میں شبہ نہیں کہ اس تفصیل سے معلومات میں بہت اضافہ ہوتا ہے۔شارح کی شعر فہمی بھی قابل داد ہے۔ اور یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ وہ غالب کے مزاج کو پوری طرح سمجھتے ہیں''[1]

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی شرح دیوانِ غالبؔ 2

پروفیسر چشتی صاحب نے شرح کے آغاز میں سوا دو سو صفحات کا ایک مقدمہ بھی شامل کیا ہے۔ جس میں غالبؔ کی سوانح حیات، شخصیت ،نفسیات، ان کے زمانے کے تہذیبی اور تمدنی حالات اور ان کے فلسفہ تصوف وغیرہ پر بہت تفصیل سے بحث کی ہے۔

اگر چہ غالبؔ کی زندگی میں ہی ان کے کمالِ فن کی قدر و منزلت کی گئی تاہم وہ خود بھی اپنے آپ کو قدر و منزلت کا مستحق سمجھتے تھے اور ان کو پورا یقین تھا کہ ایک زمانہ آئے گا جب ان کے کلام کی بہت قدر ہوگی۔ بہر حال موجودہ زمانے کی اگر بات کی جائے تو اس بات سے انکار کی گنجائش بالکل نہیں ہے کہ مقبولیت کے اعتبار سے علّامہ اقبالؔ کے سوا کوئی دوسرا شاعر ان کا ہمسر نہیں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ مرزا غالبؔ اور علّامہ اقبالؔ شارحین کی پہلی پسند رہے ہیں۔